ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.2,Issue No.2(2020)
(April to June)

مہاتما گاندھی، منٹو اور سوَراج کے لیے

Mahatma Gandhi, Manto and Svaraaj kay leye

کرن اسلم
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Mister Gandhi described his theory regarding "Svaraaj" (means self -rule) in his book "Hind Svaraaj" published in 1909. After that the book had been translated in English named "Indian Home Rule". Saadat Hassan Manto discussed the same theory of freedom from aliens in his afsana "Svaraaj kay leye". Manto's political views are clearly mentioned in the afsana. This story based on true news of a newspaper of that time. In "Svaraaj kay leye" , probably, the longest short story of Mato, he has discussed not only political, economic , social, cultural but also psychological issues of Indians after the massacre of " Jallianwala Bagh" and Gandhi's rigid attitude towards youngsters life. The afsana can be called an autobiographical story of Manto.

Key words: Freedom, Theory, Gandhi's view point, Svaraaj, Politics, Massacre, Jallianwala Bagh, Economy, Psychological issues, Manto's life events.

عنوان اور تلفظ کے اِختلافات:

1. *स्वराज* = (Pronunciation: *swaraaj.)*

(سوَچالِت اور سوَتنتر، اس کے مترادف الفاظ ہیں۔)

Meaning: Administration of self" or "democracy" or "home- rule" This word has two parts:

1 . स्व (Sva) = (سوَ) Self (this is a prefix in Hindi language)

(سوَ، میں زبر کی آواز پڑھی جائے گی نہ کہ الف کی۔)

I. **स्व (Sva) means अपना (ذاتی یا اپنا)**
II. राज (raaj) = Rule

Examples: स्वदेश (Svadesh – Motherland), स्वतंत्र (Svatantr – Self-governing), स्वार्थ (Svaarth – Self-interest 1۔

2.सौराज = (Pronunciation: sauraaj) meaning: Total freedom.

3. सोराज = (Pronunciation: *soraaj*) meaning: Total freedom from alien rule.

soraaj, " دوسرے اور تیسرے نمبر پر لکھا جانے والا لفظ " سوراج" غلط العام تلفظ ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کا تلفظ savrajj اور sauraj بھی کیا جاتا ہے، لیکن دُرست لفظ اور تلفظ وہی ہے جو عنوان کی تفصیل میں پہلے نمبر پر ہندی، انگریزی اور اُردو میں واضح کیا گیا ہے۔(۲)

"سوَراج کے لیے" سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعے "نمرود کی خدائی" میں شامل ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار شائع ہوا، جس میں بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں۔ "سوراج کے لیے" اس افسانوی مجموعے کا دوسرا اور سب سے طویل افسانہ ہے۔ افسانے کا تجزیہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے عنوان کے معنی و مفاہیم کو ایک نظر دیکھ لیا جائے کیوں کہ اِس کا عنوان خود میں پوری تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی معنویت سمجھے بغیر افسانے میں بہت سے واقعات کا بیان، الفاظ کا چناؤ اور کرداروں کی نفسیات ، اپنے دُرست اور وسیع تناظر میں سمجھنا مشکل ہے۔ عنوان کی وضاحت، افسانے کے سیاسی پس منظر کو سمجھنے میں کافی حد تک آسانی پیدا کر دے گی۔

"سوراج" تین طرح سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے تینوں تلفّظ الگ الگ علاقائی فرق کا نتیجہ ہیں۔ جس کا سرسری ذکر عنوان کے بعد دیا گیا ہے۔ ان تینوں میں الگ الگ تلفّظ کے باوجود ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے، آزادی۔ افسانے کے سیاسی پس منظر، معنویت، مجموعی فضا اور کرداروں کی بازیافت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اس کا تلفظ، لفظی تفصیل میں اوّل الذکر میں بیان کردہ ہی متصور ہو گا۔ جس کا تعلق مہاتما گاندھی کے نظریہ آزادی سے ہے۔

سوراج، دو ہندی الفاظ "سوَ" اور "راج" سے مل کر بنا ہے۔ سوَ کے معنی ہیں، "اپنا / اپنی" اور راج بمعنی "حکومت"۔ اِس کے علاوہ "حکومتِ خود اختیاری، اپنے دیس میں اپنی حکومت، جمہوری حکومت اور آزاد اِقتدار" کے معنی میں عام طور پر مستعمل ہے۔ سوراج کے معنی کی وسعت کے حوالے سے ایک ویب سائٹ کا اقتباس درج ذیل ہے۔ (۳)

The root meaning of swaraj is self-rule. Swaraj may be rendered as disciplined rule from within. 'Independence' has no such limitation. Independence may mean licence to do as you like. Swaraj is positive. Independence is negative. The word 'Swaraj' is a sacred word, a Vedic word meaning self-rule and self-restraint and not freedom from all restraints which independence often means-

سوراج کا لفظ سب سے پہلے دادا بھائی ناؤروجی نے 1906 میں کانگریس کے کلکتہ سیشن میں بات کرتے ہوئے استعمال کیا۔ دادا بھائی کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے یہ لفظ سوَامی دَیانند سرسوَتی کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" (1875) سے اخذ کیا تھا۔ اس کے بعد یہ لفظ مہاتما گاندھی کے نظریہ آزادی کے ساتھ منسلک ہو گیا۔

1908ء میں مہاتما گاندھی نے انگلینڈ سے ساؤتھ افریقہ کے سفر کے دوران میں ایک کتاب "ہند سوَراج" تحریر کی۔ یہ کتاب 1909ء میں شائع ہوئی۔ انگلستان سے جنوبی افریقہ کا یہ سفر دس 10 دنوں پر محیط تھا۔ اس مختصر مدت میں انھوں نے یہ کتاب گجراتی زبان میں تحریر کی۔ اس کی اشاعت جنوبی افریقہ کے ایک رسالے "ہندوستانی رائے" (Indian Opinion، جسے گاندھی نے جاری کیا تھا) کے خاص نمبروں میں ہوئی۔ اس کے بعد اس اشاعت کی تدوین عمل میں آئی۔ ممبئی میں اس کتاب کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مہاتما گاندھی نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو "انڈین ہوم رُول" کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ برطانوی حکومت نے اس انگریزی ترجمے پر پابندی عائد نہیں کی۔ اس کتاب کا شمار گاندھی جی کی اہم تصانیف میں کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب مکالماتی انداز میں لکھی گئی ہے، ایک قاری اور مدیر کے درمیان مکالمہ۔ قاری کے سوالات اور مدیر کے جوابات۔

انگلستان میں گاندھی جی کی ملاقات وینایک دامودر ساورکر (Vinayak Damodar Savarkar) سے ہوئی۔ یہ ہندوتوا (ایک سیاسی تحریک) نظریے کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ ساورکر اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ یہ سب ساتھی انارکسٹ تھے۔ یہ تمام افراد ہندوستان سے برطانوی راج کا خاتمہ چاہتے تھے۔ لیکن اس کا طریقہ کار پُر تشدد طریقے سے آزادی کے حصول کی کوشش تھا۔ جب کہ گاندھی جی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیشِ نظر "ہند سوارج" لکھنے کے دو مقاصد تھے۔

اوّل: تشدد کے ذریعے آزادی کے حصول کی بات کرنے والوں کو عدم تشدد کی ترغیب دینا۔

دوم: اس کتاب کے ذریعے ہندوستان کے مستقبل کے لیے لائحہ عمل تجویز کرنا۔ (۴)

اس کتاب سے ایک اقتباس دیکھیے۔ (۵)

Passive resistance is an all-sided sword, it can be used anyhow; it blesses him who uses it and him against whom it is used. Without drawing a drop of blood it produces far-reaching results. It never rusts and cannot be stolen. Competition between passive resisters does not exhaust. The sword of passive resistance does not require a scabbard. It is strange indeed that you should consider such a weapon to be a weapon merely of the weak. (Chapter 17)

(ترجمہ: باب 17) عدم تشدد (خاموش مقابلہ) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ایسی تلوار ہے اس کے دونوں جانب تیز دھار ہے۔ اسے چاہے جس کام میں استعمال کیا جائے، دونوں فریق کو فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ یہ خون کے فوارے نہیں نکال سکتی، لیکن اس سے بھی بڑے تنائج نکال سکتی ہے۔ اسے زنگ نہیں لگ سکتا۔ کوئی اسے چوری نہیں کر سکتا۔ اگر عدمِ تشدد اختیار کرنے والے مقابلے میں اترتے ہیں تو انھیں تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ایسی تلوار ہے جسے کسی میان کی ضرورت نہیں۔ اگر اب بھی آپ اسے کمزوروں کا اسلحہ مانیں تو اسے اندھیرے میں رہنا کہا جائے گا۔ (۶)

اس کتاب کی تحریر میں گاندھی جی نے دو (۲) ماخذ سامنے رکھے ہیں، جن سے وہ متاثر تھے۔

۱۔ مغربی ماخذ: جس میں چند نمایاں مغربی فلسفی اور دانش ور شامل ہیں۔ گاندھی جی ٹالسٹائی کے غیر مرکزیت کے خیالات سے متاثر تھے۔ ہند سوراج کی پہلی اشاعت کے ضمیمہ میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ایمرسن کا "خود احتسابی" کا درس بھی گاندھی جی کو متاثر کیے بنا نہ رہ سکا اور اس کا اثر بھی ان کی اس اہم تصنیف میں در آیا ہے۔ اسی طرح رسکنز سے گاندھی جی نے محنت کی عظمت کا درس لیا۔

۲۔ ہندوستانی ماخذ: اس سے مراد مختلف مذہبی کتب ہیں۔

"ہند سوراج" میں گاندھی جی نے "سوراج" کے بارے میں اپنے نظریے کو تفصیلاً بیان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوارج کے لفظی معنی کا اصل مطلب اپنے آپ پر قابو پانا ہے یعنی اس کا مطلب جمہوریت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ سیلف رُول دراصل Self-Rule ضبطِ نفس ہے۔ انفرادی ضبطِ نفس۔ مہاتما گاندھی، کے ہند سوراج کے باب چہار دہم میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم، باشندگانِ ہند آزاد ہوگئے تو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس خیال مذکورہ سے ہی آپ کو سوراج کی ایک تعریف مل گئی اور جب ہم اپنے نفس پر حکومت کرنے اور اُس پر قابو رکھنے کی قابلیت پیدا کرلی تب ہی ہم کو سوراج ملے گا۔ لہٰذا سوراج تو ہمارے ہاتھ کی مٹھی میں بند ہے۔۔۔ لیکن ہر فرد بشر کو یہ سوراج اپنے نفس کے لیے جداگانہ حاصل کرنا ہوگا۔"(۷)

یعنی برطانوی راج کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنے دل و دماغ سے اسے نکال باہر کرو۔ جو کچھ برطانوی راج نے یہاں کے عوام کو دیا ہے اس کے مقابل وہ سب کچھ خود بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کا خیال یہ بھی تھا کہ جو انگریز ہندوستانی بن کر ہندوستان میں رہنا چاہے اسے باہر نکالنا مقصد نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی نے سودیشی کو سوراج کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب ہے، "اپنے مُلک کا" یا "اپنے مُلک سے متعلق"۔ اس سے مہاتما گاندھی کی مراد یہ تھی کہ انگریزی سامان کا بائیکاٹ کیا جائے تاکہ معاشی آزادی کا سفر طے کیا جاسکے۔ اُن کا ماننا تھا کہ جو قوم اپنا کپڑا اور کھانا خود تیار کرے اسے ہی معاشی آزادی ملے گی۔ داخلیت سے خارجیت کے سفر کے لیے عوام کو آمادہ کرنے کی یہ نفسیاتی کوشش تھی۔ یہ (freedom within yourself) کے نظریے کی تشہیر تھی۔ مہاتما گاندھی کی "ہند سوراج" کے بعد جنوری 1923ء میں سوَراج کا تصور ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں سامنے اُبھر کر سامنے آیا۔ اس کا نام "کانگریس۔ خلافت پارٹی" رکھا گیا۔ کانگریسی رہنما چترنجن داس اس کے صدر منتخب کیے گئے اور موتی لال نہرو سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہ ہی دونوں رہنما اس تحریک کی بنیاد رکھنے میں پیش پیش تھے۔

مہاتما گاندھی کے سوراج نظریے میں معاشرے کے کمزور طبقے کو اُوپر لانے کی ضرورت تھی۔ ان کے خیال میں آزادی کے حصول میں گاؤں کی پنچائیت اہم کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ کیوں کہ جب گلی محلوں میں اختیارات کی تقسیم کی جائے گی تو حالات بہتری کی طرف جائیں گے اور جمہوریت اسی کا نام ہے۔ گاندھی نے سوراج اور آزادی کا باقاعدہ ایک سٹرکچر بھی واضح کیا ہے جو یوں ہے۔

Villages > Taluka > District > State > Centre.

(دیہات۔۔۔ تحصیل۔۔۔ ضلع۔۔۔ ریاست۔۔۔ مرکز)

یعنی جمہوریت کا آغاز حقیقی بنیاد کی سطح (گراس رُوٹ لیول) سے کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے خیال میں کمزور طبقے سے ہی حقیقی عوامی نمائندہ سامنے آسکتا ہے۔ اس طریق پر حاصل ہونے والا سوراج عوام میں اتفاق و اتحاد پیدا کرے گا۔ ہر کوئی اپنے فرائض ایمان داری سے ادا کرے گا۔ اس سے جرائم کی شرح کم ہو گی، کیوں کہ معاشی آزادی اور معاشی ترقی عوام کے عدم تحفظ کے احساسات میں کمی لانے کا باعث بنے گی۔

مہاتما گاندھی نے سیاست اور مذہب کو ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھا۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی سُپر پاور ہے جو سچائی پر مبنی ہے اور پوری کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔ جسے وہ بھگوان کا نام دیتے ہیں۔ بقول گاندھی کے ہر انسان کے اندر آتما کی صورت بھگوان موجود ہے اس لیے زندگی کا مقصد خود کو جاننا اور پہچاننا ہے۔ یہ سب تب ممکن ہو پائے گا جب سیلف ڈسپلن ہو گا۔ اس کے علاوہ سوراج کے تصور کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"Infect Gandhi gave priority to the individual as a self-conscious agent and refused to accept group. He declared that "swaraj of people means the sum total of the swaraj of individuals" Government over the self is the truest swaraj, it is synonymous with moksha or salvation."8

"سوَراج کے لیے" منٹو کے سیاسی افسانوں میں سے ایک اہم افسانہ ہے۔ جس کے پسِ منظر میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اس کے زیرِ اثر انسان کے نہایت جذباتی اور غیر فطری عزائم اور ان کی وجہ سے انسانی نفسیات کی اُلجھنیں اور سیاسی ڈھونگ پر طنز کا احساس دکھائی دیتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ 1919ء میں پیش آیا تو منٹو کی عمر اُس وقت سات سال تھی۔ ایک سات سال کے بچے کی نظر سے اس حقیقی واقع کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس واقع کی یاد نے منٹو سے وسیع کینوس کے سیاسی افسانے لکھوائے۔ سیاسی حوالے سے منٹو کے قابلِ ذکر افسانوں میں "تماشا، خونی تھوک، انقلاب پسند، نعرہ، نیا قانون، دیکھ کبیر ارویا، ٹیٹوال کا کتّا، سہائے، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور 1919 کی ایک بات" شامل ہیں۔ ان تمام افسانوں میں منٹو کے سیاسی نظریات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

افسانے کے سیاسی پسِ منظر کو دیکھا جائے تو منٹو نے اس افسانے میں تحریکِ آزادی کے پرچم تلے چلنے والی تحریکوں کا اثر اور ان کے نتیجے میں عوام کا ردِ عمل ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے جس کے چشم دید گواہ وہ خود ہیں۔ اُس دور میں سِول نافرمانی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ جس کے نتیجے میں عوام نے غیر ملکی مصنوعات کا استعمال اور خرید و فروخت کو ترک کیا اور گاندھی جی کے نظریے کو اہمیت دیتے ہوئے خود سوت کاتا اور کھادی پہنا۔ قیمتی غیر ملکی کپڑے عوام نے جلانے شروع کر دیے۔ اس حوالے سے منٹو نے جس طرح افسانے میں یہ منظر بیان کیا ہے وہ منٹو کے فنی رموز و علائم کی ایک واضح مثال کہی جا سکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا اور ہر چوک میں الاؤ جلنے لگے۔ لوگ جوش میں آ کر کھڑے کھڑے وہیں کپڑے اتارتے اور الاؤ میں پھینکتے جاتے۔ کوئی عورت اپنے مکان کے شہ نشین سے اپنی ناپسندیدہ ساڑی اُچھالتی تو ہجوم تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ لال کر لیتا۔"(۹)

"سوراج کے لیے" کے آغاز میں منٹو نے امرت سر کی فضا کو جلیانوالہ باغ کے سانحے کے اداس خوف سے پاک اور اس کی جگہ ایک بے خوف تڑپ جو اپنی منزل سے نا آشنا تھی، کا ذکر کیا ہے۔ منٹو کے سیاسی افسانوں میں سے "تماشا" "سوراج کے لیے" اور "1919 کی ایک بات" میں امرت سر کی فضا اور واقعات موجود ہیں۔ امرت سر، منٹو کے افسانوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ شہر تحریکِ آزادی کا ایک بڑا مرکز رہا۔ منٹو تحریکِ آزادی کے بہت سے واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ اس شہر میں منٹو نے زندگی کے بیس برس گزارے۔ اس شہر کے ساتھ منٹو کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ باری علیگ کی شاگردی، فیض احمد فیض سے ادب پڑھنا۔

اسی شہر میں منٹو نے ابو سعید قریشی اور حسن عباس کے ساتھ مل کر انقلابی کتابوں کے تراجم خفیہ طور پر شائع کیے اور ان کے اشتہار لگانے کے جرم میں گرفتار ہوتے ہوتے بچے۔

جن دنوں کے واقعات کا تذکرہ منٹو نے اس افسانے میں کیا ہے، اُن دنوں چوں کہ آزادی اور انقلاب کی باتیں ہر طرف اپنا رنگ دکھا رہی تھیں اس لیے خود منٹو کی کیفیت بھی دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس کا اعتراف خود منٹو نے بھی کیا ہے کہ " میرا حال بھی ان دنوں بہت دگرگوں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آجائے تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے۔" پڑھائی سے نفرت ہو جانا، سکول جانے کے بجائے جلیانوالہ باغ جا کر وہاں کی سرگرمیاں دیکھتے رہنا، یہ تمام صورتِ حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو کا ذہن انقلاب چاہتا تھا۔ سیاسی انقلاب اور آزادی کی خواہش منٹو کو پڑھائی کے بجائے امرت سر کی سیاسی سرگرمیوں کی جانب لے جاتی تھی۔ ان حالات میں منٹو خود تو کوئی سیاسی رہنما نہ بن سکے لیکن ان کے بچپن کا دوست غلام علی ضرور ایک عوامی شخصیت بن کر اُبھرا۔ غلام علی اس ساری کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ جو ایک سادہ اور عام ذہنی سطح کا مالک ہے لیکن سیاسی لیڈر بن جانے سے اُس کی شخصیت میں ایک وقار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عوامی اور مقبول شخصیت بن جانے کے بعد وقت یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ بالغ سیاسی شعور کا حامل انسان ہے۔

منٹو کا سیاسی شعور بھی اس افسانے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانے کے سیاسی کرداروں خاص طور پر غلام علی اور باباجی کا کردار منٹو نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو سیاسی ہی نہیں اقتصادی اور سماجی انقلاب کے بھی خواہاں تھے۔ اقتصادیات کو انھوں نے جس طرح افسانے میں سول نافرمانی کی تحریک، کھادی کا استعمال نہ صرف مردوں کی حد تک بلکہ خواتین میں بھی کھادی کے لباس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ دلہن کے روپ میں بھی نگار کھادی کی ترنگی ساڑی پہنتی ہے۔ یہ سب، منٹو کے دل و دماغ میں چلنے والی انقلابی تحریک کا ثبوت ہے۔

افسانے میں مذہب اور سیاست کو ساتھ ساتھ دکھایا گیا ہے۔ باباجی کا کردار اس کا واضح ثبوت ہے۔ "باباجی بہت پرہیز گار، خدا ترس، عالم اور ذہین آدمی تھی۔۔۔ سیاست سے گو باباجی کو بظاہر دل چسپی نہیں تھی مگر یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ پنجاب کی ہر سیاسی تحریک انھی کے اشارے پر شروع ہوئی اور انھی کے اشارے پر ختم ہوئی۔" یہ منٹو کی افسانہ نگاری کا ایک ایسا حقیقی رنگ ہے جو شاید ہی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دکھائی دے۔ "سوراج" کی تحریک کے روحِ رواں "باباجی" در اصل "مہاتما گاندھی" کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ گذشتہ صفحات میں سوراج کی تحریک کی وضاحت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ گاندھی جی مذہب اور سیاست کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ یہی خاصیت "باباجی" کی بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ افسانہ لکھا ہی "باباجی" کے آشرم کی وجہ سے گیا ہے تو غلط نہ ہو گا۔ منٹو کی زندگی کے واقعات اور مشاہدات چوں کہ اکثر ان کے افسانوں کی تخلیق کی وجہ بنتے رہے ہیں اس لیے میز پر رکھے اخبار کی سرخی "سوراج کے لیے" کی تخلیق کا محرک بن گئی تھی۔ وہ سُرخی کیا تھی؟ اس بارے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "منٹو نے جس دِن یہ افسانہ لکھنا شروع کیا، اُس سے کچھ دِن پہلے یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی کہ مہاتما گاندھی نے اپنے آشرم میں ایک جوڑے کی شادی اپنے ہاتھوں

سر انجام دی۔ اور اس جوڑے نے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ
جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو گا وہ دوستوں کی طرح رہیں گے۔(نہ کہ زن و شوہر کی
طرح)" (۱۰)

بقول اوپندر ناتھ منٹو یہ خبر پڑھ کر استہزا سے مسکرا دیے تھے۔ مذکورہ بالا اقتباس اس افسانے کے بہت سے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، مثلاً: سیاسی رہنماؤں کی دوہری شخصیت، ان کے ظاہر و باطن کا تضاد کہ کس طرح وہ لوگ عوام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

سعادت حسن منٹو ایک ماہر نفسیات دان کی طرح اپنے افسانے کی فضا اور کرداروں کا نفسیاتی جائزہ لیتے اور ان کی گرہیں کھولتے بھی دِکھائی دیتے ہیں۔ جب منٹو امرت سر کا ذکر کرتے ہیں تو اس شہر کے لوگوں کے اجتماعی مزاج یا نفسیات کو نمایاں کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"چھوٹا شہر ہے وہاں نیک نام ہوتے یا بدنام ہوتے دیر نہیں لگتی۔۔۔ یوں تو امرت
سری عام آدمیوں کے معاملے میں بہت حرف گیر ہیں۔یعنی ہر شخص دوسروں کے عیب
ٹٹولنے اور کرداروں میں سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔"(۱۱)

لیکن ساتھ ہی سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے دوغلے پن کو نظر انداز کرنے کی عادت بھی واضح کی ہے، لکھتے ہیں: "لیکن سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے معاملے میں امرت سری بہت چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔"(۱۲)

افسانے کا مرکزی کردار، غلام علی، جو امرت سر میں منٹو کا دوست تھا، جب کانگرس میں شریک ہوتا ہے تو منٹو کو اپنے افسانے کے لیے جیسے نیا موضوع مل جاتا ہے۔ یہ کردار ایک حقیقی کردار ہے۔ شاید اس حقیقی کردار کی وجہ سے ہی اس افسانے میں منٹو خود بھی ایک کردار کے طور پر موجود ہیں۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں خود کو بطور ایک کردار کئی بار پیش کیا ہے۔ منٹو باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرنے والوں میں سے نہیں بلکہ خود سمندر میں چھلانگ لگا کر کرداروں کے ساتھ تیر کر گہرائی کا اندازہ لگاتے اور انسانی نفسیات کے راز کھولتے ہیں۔ منٹو جس عہد میں افسانہ لکھ رہے تھے اُس دور میں افسانہ نگار کا اپنے حقیقی نام کے ساتھ، بحیثیت ایک کردار کے افسانے میں شامل ہونا زیادہ مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک عمومی خیال یہ تھا کہ اس طرح مصنف کی شخصی چھاپ افسانوں میں دکھائی دیتی ہے اور افسانے میں سے افسانویت کم ہونے لگتی ہے۔ اس کے باوجود یہ منٹو کی انفرادیت ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے احساسِ کمتری کو درمیان میں لائے بغیر اپنے افسانوں میں ایک فعال کردار کے طور پر موجود رہے۔ دل چسپی کی بات یہ ہے کہ اس سے ان کے افسانوں کی نہ تو معنویت میں کمی آئی اور نہ ہی ان کا سے افسانوی رنگ پھیکا پڑا۔

افسانے میں منٹو کی اپنی موجودگی، بعض جگہ منٹو کی آپ بیتی کا روپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ "سوراج کے لیے" میں بھی منٹو کی مختصر سی آپ بیتی ان الفاظ میں دکھائی دیتی ہے:

"کئی برس گزر گئے۔۔۔یہ بے کیف تھکاوٹ ہندوستان سے دور نہ ہوئی تھی۔۔میری دنیا میں چھوٹے موٹے کئی انقلاب آئے۔۔ داڑھی مونچھ اُگی، کالج میں داخل ہوا۔ ایف اے میں دو بار فیل ہوا۔۔۔والد انتقال کر گئے روزی کی تلاش میں ادھر اُدھر پریشان ہوا۔ ایک تھرڈ کلاس اخبار میں مترجم کی حیثیت سے نوکری کی۔ یہاں سے جی گھبرایا تو ایک بار پھر تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا، علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور تین ہی مہینے بعد دِق کا مریض ہو کر کشمیر کے دیہاتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہاں سے لوٹ کر بمبئی کا رُخ کیا۔ یہاں دو برسوں میں تین ہندو مسلم فساد دیکھے۔ جی گھبرایا تو دِلّی چلا گیا۔ وہاں ہر چیز بمبئی کے مقابلے میں سست رفتار دیکھی۔۔۔۔دلّی میں دو برس ٹھنڈی زندگی بسر کرنے کے بعد سدا متحرک بمبئی چلا آیا۔"(۱۳)

افسانے کی فضا کچھ باغیانہ اور انتقامی جذبے کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ ان دنوں چوں کہ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ابھی ذہنوں میں تازہ تھا اور پھر جنرل ڈائر کی فوج نے بیساکھی کے تہوار پر نہتے شہریوں کا قتلِ عام کر کے عوام میں انگریز کے خالف نفرت اور انتقام کا جذبہ بھر دیا تھا۔ افسانے کے جذباتی مناظر ظاہر کرتے ہیں جیسے سارا جوش اور غم وغصّہ امرت سر کے عوام میں امڈ آیا تھا۔ جلسے کرنا، نعرے بازی اور گرفتار ہونا ایک شغل بن گیا تھا۔ پولیس کا خوف دلوں سے نکل چکا تھا۔ اسی جوش میں ہی لوگوں نے اپنے کپڑے جلائے۔

غلام علی، جو کہ کمزور طبقے کا نمائندہ ہے، اسی انقلابی جوش و جذبے کے تحت لیڈر بنتا ہے۔ کھادی پہنتا ہے۔ ایسی تقریریں کرتا ہے جو منٹو کو حیران کر دیتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان میں آنے والی تبدیلیاں ایک فطری عمل ہے۔ منٹو کا مرکزی کردار غلام علی بھی وقت اور حالات کے ساتھ اپنے خیالات واحساسات میں تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ ایک وقت میں کھلنڈرا پن اس کی شخصیت کا حصّہ تھا اور پھر سیاسی مزاج میں ڈھل کر نہ صرف اس کی ظاہری شخصیت میں تبدیلی آتی ہے بلکہ اس کے مزاج اور طبیعت میں سنجیدگی اور وقار پیدا ہو گیا تھا۔ اسی بڑی تبدیلی کے زیرِ اثر جب وہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے باپ نہ بننے کا عہد کرتا ہے، ان لمحوں کا غلام علی اور پھر ایک طویل مدت تک اولاد سے محرومی کے احساس کا پیدا ہونا ایک بالکل مختلف غلام علی کو سامنے لے کر آتا ہے اور پھر ایک آخر میں ایک گھریلو قسم کا انسان۔ ہر بدلتے وقت کے ساتھ اس کی نفسیات کو منٹو نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً: "یہ لوگ اُونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔خدا کے لیے انسان کو انسان ہی رہنے دو۔۔۔"ربڑ کا لمس ، غلام علی کی نفسیات سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام علی کی زبانی پیش کی جانے والی تفصیل چند جملوں میں بھی پیش کی جا سکتی تھی۔

اسی طرح "نگار" کا کردار بھی ایک ایسا فطری کردار ہے جو غلام علی کی ہی طرح خود میں تبدیلیاں محسوس کرتی ہے۔ منٹو کے کرداروں میں ہمیں ایک فطری انسان نظر آتا ہے۔ جو محبت بھی کرتا ہے اور سماج سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ ایک غلام قوم کے فرد کی ماں بننا اُسے بھی گوارا نہیں تھا۔ وہ نگار جس نے غلام علی سے محبت کی اور پھر شادی کے بعد ایک فطری عورت کو خود میں دفن کرنا

چاہا، ایک دوسرے سے مختلف سوچ کی مالک ہے۔ جذبات و احساسات کے سامنے ہار جانے اور فطرت سے ہم آہنگ رہنے کے جواز تلاش کرتے ہوئے غلام علی کی نفسیات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ ایک ماہر نفسیات دان ہی کر سکتا ہے۔ منٹو نے ان نفسیاتی الجھنوں کو جس طرح تحلیلِ نفسی کی تکنیک میں پیش کیا ہے وہی منٹو کا اُسلوب بن کر سامنے آتا ہے۔ بقول طاہرہ اقبال:

> "منٹو نے انسانی نفسیات کی پیچیدہ تہیں کھولیں اور باطنی گتھیاں سلجھائیں۔ جذبات و احساسات کو ناپا اور ان رمز آشنائیوں کے لیے جس زبان کو استعمال کیا، وہی منٹو کی ذاتی پہچان بن گئی۔" (۱۴)

منٹو کو چوں کہ خلافِ فطرت جانے سے نفرت تھی اس لیے اس کا اظہار بھی اُنھوں نے بہت واضح الفاظ میں کرتے ہوئے دیگر کرداروں کے باطن کو بھی پیش کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "میں نے جماعتیں اور درس گاہیں دیکھی ہیں۔۔۔ ماتھے پر محراب۔۔۔ چہرے پر گھنی داڑھی۔۔۔ نماز پڑھتے جا رہے ہیں اور ہر ایک چہرے پر حیوانیت۔۔۔ مصلّے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔" اِسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "بابا جی کا آشرم میں نے اب بھی نہیں دیکھا مگر جو نفرت مجھے اس سے پہلے تھی، اب بھی ہے۔ وہ جگہ جہاں فطرت کے خلاف اصول بنا کر انسانوں کو ایک لکیر پر چلایا جائے میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آزادی حاصل کرنا بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے حصول کے لیے آدمی مر جائے، میں اس کو سمجھتا ہوں، لیکن اس کے لیے اگر اس غریب کو ترکاری کی طرح ٹھنڈا اور بے ضرر بنا دیا جائے تو یہ میری سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔"

فطرت کے خلاف چلنے سے انسان، انسان نہیں رہتا اور نہ ہی خدا ملتا ہے۔ اس بارے میں منٹو نے اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "فطرت کی خلاف ورزی ہر گز ہر گز بہادری نہیں۔۔۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں کہ تم فاقہ کشی کرتے کرتے مر جاؤ، یا زندہ رہو۔۔۔ قبر کھود کر اس میں گڑ جانا اور کئی کئی دن اس میں دم سادھے رکھنا، نوکیلی کیلوں کے بستر پر مہینوں لیٹے رہنا، ایک ہاتھ برسوں اُوپر اُٹھائے رکھنا، حتیٰ کہ وہ سوکھ سوکھ کر لکڑی ہو جائے۔۔۔۔ ایسے مداری پنے سے خدا مل سکتا ہے نہ سوراج۔۔۔" (۱۵)

یہاں منٹو نے اسی نظریے کی بات کی ہے جسے مدتوں پہلے بلھے شاہ نے بیان کیا تھا:

> جے رب ملدا جنگل بیلے یاں ملدا گاواں وچھیاں
> جے رب ملدا اوچ مسیتی تاں ملدا اچم چڑکیاں
> وے بُلھیا رب اُنھاں نوں ملدا نیتاں جنہاں دیاں سچیاں

سعادت حسن منٹو نے کرداروں کی نفسیات کو اور ان کے باطن کو بے نقاب کرنے ساتھ ساتھ انھی کے ذریعے اس افسانے میں برِصغیر کے ثقافتی پہلو بھی پیش کیے ہیں۔ "سوراج کے لیے" کی بُنت کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں ثقافتی رنگ کے ساتھ

تحریکِ آزادی کے مناظر اور واقعات شامل ہیں۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ، بے یقینی کی فضا، انتقامی جذبے، جوش اور ہند مسلم فسادات نے عوام کے دل و دماغ سے ثقافتی رنگ مٹنے نہیں دیا۔ منٹو نے افسانے میں ہند اسلامی کلچر کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے لوگوں نے ایک دوسرے کی روایات اور ثقافت کو اپنایا تھا۔ عید کے موقع پر اگر ہندو اور سِکھ گھرانوں سے مسلم گھرانوں میں مبارک باد بھیجی جاتی تھی تو دیوالی اور دسہرہ منانے میں بھی مسلم خاندان اپنے ہندو ساتھیوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

نگار، ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے منٹو نے ہند اسلامی تہذیب پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ غلام علی اور نگار کی شادی کی رسومات میں بھی دونوں مذاہب کی روایات کا خیال رکھا گیا۔ پہلے ایک مولوی صاحب نے قرآنی آیت پڑھی اور نکاح پڑھایا اس کے بعد نگار کی ایک سہیلی نے غلام علی کو سیندور کی ایک ڈبیا دی اور غلام علی نے نگار کی مانگ میں سیندور بھر دیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو منٹو کا یہ افسانہ منٹو سیاسی اور نفسیاتی حوالوں سے اہم ہونے کے ساتھ منٹو کے فن کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔ منٹو جو کہ ایف اے میں دو بار فیل ہونے کا اعلان کرتے ہیں، وہی جب افسانی لکھتے ہیں تو اُردو زبان کے روز مرہ اور محاورہ کا خیال اس طرح رکھتے ہیں جیسا کہ ایک ماہر لسانیات کو رکھنا چاہیے۔ اس چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ غیر ملکی چیزوں کے بائکاٹ کے نتیجے میں جب لوگوں نے اپنے کپڑے جلائے تو جلتے ہوئے الاؤ میں، عورتوں کا اپنی "ناپسندیدہ" ساڑھیاں پھینکنے پر عوام کا تالیاں بجانا۔ اس منظر میں سے اگر "ناپسندیدہ" کا لفظ خارج کر دیا جائے تو عورتوں کی نفسیات کی درست اور مکمل عکاسی نہیں ہو پائے گی۔ منٹو کے اسلوب کے حوالے سے طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

> "اُن کا اسلوب خارجیت اور معروضیت کی سمت مائل ہے۔ جس میں جسمانی لپک، بھیڑ بھاڑ کی نفسیات، ظاہری مراسم و رشتے، غرض زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ فنکارانہ ساخت میں ڈھلتی ہے۔"(۱۶)

سعادت حسن منٹو کی تحریر سیاست کو زیرِ بحث لائے یا نفسیات کو، تحلیلِ نفسی سے کام لیا ہو یا شعور کی رو سے، چاہے نگار ہو یا سوگندھی، خوشیا ہو یا ڈرپوک کا جاوید، منٹو کے بے باک اندازِ بیان منٹو کو انفرادیت بخشتا ہے۔ یہی انداز منٹو کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بھی ہے۔ لیکن بقول ڈاکٹر صائمہ ارم "منٹو کی مقبولیت میں تو اضافہ ہوا ہے لیکن قبولیت میں نہیں۔ اگر یہی اندازِ بیان اپناتے ہوئے منٹو آج کے دور میں لکھتے تو کسی چوک میں اندھی، بلکہ جانی پہچانی گولی کا شکار ہو جاتے اور گولی چلانے والے کو ہار پہنائے جاتے۔"(۱۷)

مختصر یہ کہ "سوراج کے لیے" ایک ایسا افسانہ ہے جس کے ایک ایک جملے پر تجزیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ، ہر جملہ اپنے اندر ایک کہانی، ایک تاریخ سمیٹے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ نفسیاتی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے منٹو کا ایک نہایت اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے کی اہمیت کا اندازہ شمیم حنفی کی اس رائے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"منٹو اپنی "سیاسی" کہانیوں (نیا قانون، سوراج کے لیے) اور کشمیر، جلیانوالہ باغ، تقسیم، فسادات، ہندوستانی سیاست دانوں سے متعلق افسانوٰ اور غیر افسانوی تحریروں، ان سب میں اپنے زمان و مکاں میں رہتے ہوئے بھی، ان سے آگے آگے چلتا ہے اور ایک ایسی تاریخ لکھتا ہے جو واقعہ نویس اور مؤرخ نہیں لکھ سکتے۔" (۱۸)

حوالہ جات

1. https://blogs.transparent.com/hindi/ten-important-prefixes-in-hindi/

۲۔ پروفیسر شبنم ریاض، پنجاب یونیورسٹی، شعبہ ہندی کی ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ سے تفصیلی ٹیلی فونک گفتگو۔ مورخہ: ۱۶۔ دسمبر ۲۰۲۰، وقت: صبح ۹:۵۰

(پروفیسر شبنم ریاض کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔ اُنھوں نے چندی گڑھ سے میٹرک کیا اور اس کے بعد کا تمام عرصہ وہ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کی طالبِ علم رہیں۔ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ سے ایم۔ اے ہندی کے بعد ان کی شادی ہوگئی اور وہ رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے لاہور آ گئیں۔ اُنھوں نے پنجابی یونیورسٹی سے نہ صرف ایم۔ اے ہندی کیا بلکہ ہندی زبان و ادب میں ایک سالہ ڈگری پروگرام "پربھاکار" کا امتحان بھی پاس کیا۔ وہ نہ صرف شدھ ہندی بلکہ گرمکھی پنجابی کی بھی ماہر ہیں۔ ۲۰۰۲ سے وہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے شعبہ ہندی میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔)

3.https://www.owlgen.in/explain-gandhis-views-on-swaraj/

4. https://rafeeqemanzil.com/?p=3246

5. https://www.mkgandhi.org/hindswaraj/chap17_passiveresistance.htm

6. ibid

۷۔ مہاتما گاندھی، "سوراجِ ہند یعنی آزادیِ ہندوستان" مترجم، بشیر الدین احمد، نیو دہلی: یونیورسل پرنٹنگ پریس، ۱۹۲۱، ص: ۱۷

8. https://www.owlgen.in/explain-gandhis-views-on-swaraj/

۹۔ سعادت حسن منٹو، سوراج کے لیے، مشمولہ "نمرود کی خدائی" دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۹۰، ص، ۱۲

۱۰۔ اوپندر ناتھ اشک، منٹو میرا دشمن، الہ آباد: نیا ادارہ، ۱۹۷۹، ص، ۹۹

۱۱۔ سعادت حسن منٹو، سوراج کے لیے، مشمولہ "نمرود کی خدائی" دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۹۰، ص، ۱۴

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، ص، ۳۶۔۳۷

۱۴۔ طاہرہ اقبال، "منٹو کا اُسلوب (افسانوں کے حوالے سے)"، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲، ص، ۸۱

۱۵۔ سعادت حسن منٹو، سوراج کے لیے، مشمولہ "نمرود کی خدائی" دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۹۰، ص، ۴۹

۱۶۔ طاہرہ اقبال، "منٹو کا اُسلوب (افسانوں کے حوالے سے)"، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص: ۸

۱۷۔ صائمہ اِرم، ٹیلی وژن انٹرویو، "سخن ٹی وی" ۱۸۔ جنوری ۲۰۲۱ء

(https://www.youtube.com/watch?v=SFxoaGELNPk&t=5s)

۱۸۔ شمیم حنفی، "منٹو: حقیقت سے افسانے تک" دہلی: دلّی کتاب گھر، ۲۰۱۲ء، ص، ۲۵۷